مولانا محمد حنیف ندوی

اساسیاتِ اسلام

ایک اشکال اور اس کا حل

کسی دین کے اساسیات یا بنیادی عقائد کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس دبستانِ فکر و نظر کی بہار کن گل بوٹوں کی رہینِ منت ہے۔ اس کے ارکان کی کیا نوعیت ہے؟ اور یہ کہ اس میں وہ کون عناصر، یا بنیادی اصول ہیں جن پر اس کی عمارت استوار ہے؟ بظاہر یہ سوال بہت سادہ اور صاف ہے۔ لیکن اس میں ایک الجھاؤ ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر ہر دین ایک خاص تاریخی ماحول (historical setting) میں اُبھرتا ہے، مخصوص اور متعین اقدار کی روشنی میں ترقی کرتا اور پروان چڑھتا ہے۔ اب اگر یہ تاریخی ماحول بدل جاتا ہے اور ان اقدار کی اہمیت میں فرق آجاتا ہے کہ جن کی روشنی میں اس نے قبولیت و پذیرائی کی منزلیں طے کی ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ ارکان اور بنیادی تصورات کی قدر و قیمت بھی از سرِ نو متعین کرنا پڑے گی اگر معاشرہ جامد نہیں ہے اور تہذیب و تمدن کی شعبدہ طرازیاں ہر ہر دور میں نت نیا روپ اختیار کرتی رہتی ہیں تو اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہر ہر تہذیب اپنے لیے اساسیات کے نئے پیمانے وضع کرے۔ نئے اصول تراشے، اور عقیدت و وابستگی کے نئے نئے صنم خانے تعمیر کرے یہی وجہ ہے کل جو بات اہم تھی اور کل جو بحث ہماری تمام تر توجہات کو گھیرے ہوئے تھی ممکن ہے کہ آج اس کی سرے سے کوئی قدر و قیمت ہی نہ ہو۔ جن لوگوں نے مختلف مذاہب و ادیان کی فکری تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ ماضی میں جس مسئلہ پر گردنیں کٹی ہیں سولیاں گڑی ہیں اور انسانی جسموں کو آگ میں زندہ جھونکا اور بھونا گیا ہے اور جس مسئلہ پر سخت جوش اور اشتعال پیدا ہوا ہے آج وہ مسئلہ شائستہ التفات ہی نہیں۔

دوسری طرف دین کی استواریاں ایک خاص طرح کا تعین چاہتی ہیں اور ایمان وعمل کی پختگی اس بات پر موقوف ہے کہ جس شئے کے ساتھ جو وابستگی قائم کر دی گئی، وہ قیامت تک علیٰ حالہٖ قائم رہے۔ لیکن اس میں دشواری کا پہلو یہ ہے کہ یہ جس دَور میں اُبھرتا اور ترقی کرتا ہے، اور جس معاشرہ کی اصلاح و رہنمائی کی خاطر عقاید و رسوم کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ اس کی رعایت ہی سے بہرحال اس کے اساسیات اور عقائد و اصول کی تعیین ہوتی ہے۔ اس اشکال کی وجہ سے ناممکن ہو جاتا ہے کہ ماضی بعید میں جن چیزوں کو بنیادی سمجھ لیا گیا تھا آج بھی اُن کے ساتھ انہی اہمیتوں کو وابستہ رکھا جا سکے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ پُرانی شراب کو نئی بوتلوں میں انڈیلا جا سکے۔ لیکن اگر شراب ہی بدل جائے اور پینے والوں کے ذوق و تشنگی کا معیار ہی اور ہو جائے تو اس صورت میں مے نوشی کی پُرانی روایات کو بعینہٖ زندہ رکھنا دشوار ہو جائے گا۔ ایسے حالات میں نہ صرف آلات مے نوشی ہی بدلیں گے بلکہ وضع و آداب کے تیور بھی مختلف ہوں گے۔

زیادہ واضح لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیے کہ دراصل کشمکش تاریخ اور ابدیت کے دو مختلف النوع تقاضوں میں ہے۔ تاریخ یہ چاہتی ہے کہ اس کی تشریح و تعبیر کے لیے ایک متعین دَور کو سامنے رکھا جائے اور انہی اصطلاحوں، پیمانوں اور معیاروں سے تعرض کیا جائے جو اس دَور اور زمانہ میں رائج تھے، لیکن دین کا رشتہ ابدیت سے ہے، اور زمانے کی مختلف کروٹوں سے ہے۔ اس کا دعوےٰ اس کے برعکس یہ ہے کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سرچشمہ ہدایت ہے اور ہر ہر دَور میں اس کی روشنی سے تہذیب و تمدن کی ضوافشانیوں میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

آسانی فہم کے لیے زیادہ موزوں یہ ہوگا کہ ہم دین و تاریخ کے اس عموم کے دائرہ سے نکل کر اس خاص دین کے بارہ میں گفتگو کریں جس کے اساسیات کی ہمیں آیندہ صفحوں میں وضاحت کرنا ہے اور یہ بتائیں کہ اس راہ کی دشواریاں کیا ہیں؟ مختصر پیرایہ بیان میں اس سلسلہ میں اشکال کی نوعیت یہ ہے کہ اسلام کے اساسیات کی تعیین و تحدید کا جہاں تک تعلق ہے ایک فطری اور سیدھا سادا طریق جو ہر شخص کے ذہن میں آتا ہے وہ تو یہ ہے کہ ہم قرآن حکیم کی ورق گردانی کریں اور یہ دیکھیں کہ اس نے اپنے پیغام دعوت میں کن امور پر زیادہ زور دیا ہے، کن چیزوں کو بار بار بیان کیا اور دہرایا ہے، اور عقائد، عبادات، اور اخلاق و معاشرت کے وہ کون سے جانے بوجھے پیمانے ہیں کہ

جن کو منوانے کے لیے دلائل و براہین اور ترغیب و ترہیب کے مختلف اسلوب استعمال فرمائے ہیں۔ اس اندازِ فکر و تدبر سے نہایت آسانی کے ساتھ یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ اسلام نے زندگی کا جو لائحۂ عمل پیش کیا ہے ان میں کن چیزوں کو اساسی و بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس طریقِ استدلال میں دشواری یہ حائل ہے کہ ہر ہر دور میں معاشرہ کی تبدیلیاں یہ چاہتی ہیں کہ ایک ایسا دین جو تاریخ سے ماورا ہے اور جو ابدیت و اتمام کا دعوے دار ہے اس میں ان تقاضوں کا بھی خیال رکھا جائے یا صرف انہی تقاضوں کو درخورِ اعتنا سمجھا جائے جو معاشی، اجتماعی، اور فکری ارتقا سے اُبھرتے ہیں۔ آج کا انسان مثلاً یوں سوچتا ہے کہ تہذیب جدید کی پیچیدگیوں نے موجودہ دور میں انسان کو جن پریشانیوں سے دوچار کر رکھا ہے اسلام ان کے مقابلہ میں فرد کی تسکین خاطر کے لیے کیا تعلیمات پیش کرتا ہے۔ علوم و فنون کی ترقی کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اکتشافات کا کس ہمت و جرأت سے مقابلہ کرتا ہے۔ کائنات کے بارہ میں اس کے عقائد کی نوعیت کیا ہے۔ مادی زندگی اور دنیوی آسائشوں کو یہ کس درجہ شائستہ اعتنا سمجھتا ہے تاریخ سے متعلق اس کی کیا رائے ہے۔ تقسیم دولت کے معاملہ میں یہ کس مدرسۂ فکر کا حامی ہے۔ معاشرہ میں مقامِ عدل کے سلسلہ میں یہ کن اقدامات کو ضروری خیال کرتا ہے۔ اسی انداز سے آج کا انسان یہ جاننا چاہتا ہے کہ سیاسیات کی زلفِ پریشاں کو اسلام کیونکر سلجھاتا اور تنور و ضو عطا کرتا ہے؟ یہ ہیں اس دور کے اساسی اور بنیادی سوالات جن کا جواب دیے بغیر ہم کسی دین کے اساسیات کی اہمیت کو اُجاگر نہیں کر سکتے۔

ان حالات میں حل طلب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اساسیات کے ان دو مختلف نقشوں میں تطبیق کی صورت کیا ہو گی۔ پہلا نقش جو قرآن سے ماخوذ ہے۔ ان میں جن چیزوں کو خصوصیت سے اہمیت حاصل ہے وہ ایمان باللہ کا عقیدہ ہے۔ ایمان بالرسل کا نظریہ ہے۔ حیاتِ خروی پر یقین رکھنا ہے۔ صلوٰۃ، زکوٰۃ اور حج و صوم کی پابندی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ ظاہر ہے کہ عقاید و افکار کا دوسرا نقشہ جو موجودہ حالات نے ترتیب دیا ہے اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں جن عقاید کو اوّلیں اہمیت حاصل ہے وہ فرد کی ذہنی اور وجدانی تسکین ہے۔ علوم و فنون کا درجہ و مقام ہے۔ سائنس کا چیلنج اور اس کا جواب ہے۔

مادی زندگی کی ترقی ہے، علم الکائنات ہے، فلسفہ تاریخ ہے، تقسیم دولت کے بارہ میں عادلانہ اسلوب وعمل کی وضاحت ہے۔ کہنا چاہیے کہ اس نقشہ میں اس سوال کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے کہ کس نوع کا نظام حکومت بنی نوع انسان کے حق میں زیادہ بہتر اور نفع آور ثابت ہوسکتا ہے۔

ہمارے نزدیک اسلام نے اس اشکال کا جواب دو طریق سے دیا ہے۔ ایک تو اس نے "ارکان خمسہ" کی ترتیب میں ایسی جامعیت رکھی ہے کہ ان میں وہ تمام فکری وعملی تقاضے سمٹ آئے ہیں کہ جن کی انسان کو ہر ہر دور میں ضرورت ہے۔ یہ پانچ ارکان دراصل ارتقائے حیات وتکمیل فکر کی وہ پانچ بنیادیں ہیں کہ جن پر معاشرہ آگے چل کر تہذیب وتمدن کے پُرشکوہ عرفے تعمیر کرسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی حیثیت ایسی جامع اقدار کی ہے کہ جن میں تمام نصب العین اور منزلیں پوشیدہ ہیں کہ جن کی طرف انسانیت کو بڑھنا، اور ہر ہر زمانہ میں حرکت کنان رہنا ہے اور یہ کام علما اور صاحب بصیرت حضرات کا ہے کہ یہ اپنے اپنے دور میں عصری ضروریات اور تقاضوں کے مطابق ان ارکان سے زندگی کا نقشہ مستنبط کریں، ان کی روشنی میں آگے بڑھیں اور یہ دیکھیں کہ ان میں اعلیٰ ترقی اور فائق تر تہذیب کے کون کون مضمرات پائے جاتے ہیں۔ ان سے کیا سیکھ سکتے ہیں اور کس طرح ان کو مان کر زندگی کے رواں دواں قافلوں کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔

ارکانِ خمسہ کے بارہ میں یہ نقطہ نظر اس وقت پیدا ہوگا، جب ہم اسلام کا مطالعہ اس رخ سے کریں گے کہ یہ جس دین کو پیش کرتا ہے اس کا تعلق صرف تاریخ کی مجبوریوں ہی سے نہیں بلکہ حال اور مستقبل کے تقاضوں سے بھی ہے اور یہ کہ یہ دین اگرچہ ماضی کے ایک متعین دور میں آیا ہے تاہم اپنے مزاج، ترتیب اور خواص کے اعتبار سے اس کی وسعتیں اور پہنائیاں انسانی تہذیب وتمدن کی تمام تر رنگ وتاز کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوتے ہیں۔ اس کی روشن اور تابناک تعلیمات کی بدولت اب تک نوع انسانی نے جو کچھ پایا اور حاصل کیا ہے وہ بجائے خود منزل نہیں نشان منزل اور دلیل منزل ہے۔ انسان کو اس کی قیادت میں ابھی اور بڑھنا اور ترقی کرنا ہے فکر کو اور گہرائیاں بخشنا ہے۔ عمل کو اور شائستہ بنانا اور سنوارنا ہے اور تہذیب اور تمدن کی نشاط کو نئی ترتیب سے آراستہ کرنا ہے۔

آیندہ صفحات میں ہم یہ ثابت کریں گے کہ تجدید و اصلاح کا پورا پورا پروگرام قرآن حکیم کے بیان کردہ نقشہ میں موجود ہے۔ اور اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی بات ایسی نہیں جو انسانیت ابدی تقاضوں کے منافی ہو۔ بلکہ اس میں ایسی روشنی اور ہدایت کے ایسے خزائن پوشیدہ کہ جن سے رہتی دنیا تک انسان بہرہ مند رہے گا۔

دوسرا طریق جس سے قرآن حکیم نے تاریخ و ابدیت کے اشکال کو رفع کیا ہے اور دونوں ایک طرح کا ربط اور توازن قائم رکھا ہے وہ ان تصریحات و اشارات سے تعبیر ہے کہ جن میں انہ وسعت و گیرائی پائی جاتی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایک کتاب جو آج سے چودہ صدیاں پہلے ہوئی جس نے مختلف حالات میں خاص روایات، عقاید اور افکار کا سامنا کیا، کیونکر اس درجہ وسیع اور جامع ہو ہے اور کیونکر اس خوبی اور کمال یا سلیقے سے ان مسائل تازہ اور اشکالات حاضرہ سے عہدہ برآ ہی ہے۔ اور ان کے مقابلہ میں واضح ہدایات اور نظریات کی وضاحت کر سکتی ہے کہ جو آج یا کو درپیش ہیں۔ پرانی اور قدیم الہامی کتابوں کے معاملہ میں بدنصیبی کا یہ پہلو نمایاں ہے کہ کے سرسری مطالعہ ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جن تعلیمات کی حامل ہیں ان کا یکسر ان وقتی اور ہنگامی نوعیت کے مسائل سے ہے کہ جو اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ یہی وجہ ان کے پیرایہ بیان، دلائل، مسائل اور پس منظر میں ایک مخصوص دَور کی جھلک اور فرسودگی درجہ نمایاں ہے کہ آج کا قاری ان کے بارہ میں اپنے دل میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتا ازیں ان کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے ان کتابوں میں از راہ تحریف دَور کے خیالات، اوہام اور تضادات کو اس طرح شامل کر دیا ہے کہ جن کی وجہ سے روشنی کے اس زمانہ میں ان کی افادیت ہی ختم ہو گئی ہے۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ ان کتابوں کی ی نے اس حد تک وسعت حاصل کر لی ہے کہ ان میں جو تھوڑی بہت سچائیاں ہیں س وقت تک تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا جب تک ان کے ساتھ از منہ قدیمہ کے اوہام غلط میں پیش کئے گئے تاریخی واقعات اور کائنات سے متعلق نیم پختہ اور مبنی بر اوہام تصورات ده و ایمان کا جزو نہ قرار دیا جائے۔

ظاہر ہے کہ اس گراں قیمت پر انسان ان پیمانوں کو قبول کر لینے سے قاصر ہے۔ اس کے برعکس

قرآن حکیم اپنی تابندہ تر تعلیمات، اپنے مخصوص اور دلکش پیرایہ بیان اور اپنی بے نظیر جامعیت کے لحاظ سے نہ صرف اس دور کی کتاب معلوم ہوتا ہے بلکہ اپنے بعض مضمرات تعبیر کے لحاظ سے تو یہ کتاب فکر و معنی کی ایسی درخشانیاں اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے جن کا تعلق نہ صرف حال کے مسائل سے ہے، بلکہ مستقبل کے اشکالات سے بھی ہے۔ اس میں اس دور کی پریشانیوں کا علاج بھی ہے اور آیندہ کی الجھنوں کا حل بھی۔ اس کے ادنیٰ مطالعہ ہی سے قلب و ذہن پر یہ تاثر مرتسم ہوتا ہے کہ یہ کتاب چودہ سو سال کے بعد بھی تازہ تر معانی کی حامل ہے یعنی اس کے افق پر سینکڑوں آفتاب پنہاں ہیں جو طلوع کے لیے بے قرار ہیں اور اس کی تہ میں اب بھی ہزاروں موتی ایسے پوشیدہ ہیں جو سطح آب پر جلوہ طرازی کے لیے بے چین ہیں۔ قرآن کریم کی یہ ہمہ گیر خوبی ہے کہ قاری ہر آن اس میں معنی و تعبیر کی نئی شان دیکھتا ہے۔ نئی اداؤں اور انوکھے پہلوؤں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس میں کہیں تضاد نظر نہیں آتا کہ کبیر فرسودگی یا بدمزگی پیدا نہیں ہوتی اور کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دیتی جو دورِ حاضر کے تقاضوں کے منافی ہو۔ اس کتاب نے تاریخ و ابدیت یا ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان اس توازن کے ساتھ ربط و تعلق کی نوعیتوں کو اُجاگر کیا ہے کہ چودہ سو سال کے لمبے اور طویل ترین فاصلے کے باوجود یہ آج بھی قلب و ذوق کے قریب تر محسوس ہوتی ہے۔

اس بنا پر ہمارا معاملہ آسان ہے، ہم اگرچہ تفصیل و وضاحت کے پیشِ نظر زندگی کے انہی بنیادی سوالات کو غور و فکر کا محور قرار دیں گے جن کو موجودہ دور کے اجتماعی و علمی تقاضوں نے اُبھار دیا ہے۔ تاہم جہاں تک روشنی حاصل کرنے یا ثبوت دعویٰ کے لیے درجہ استناد کا تعین کا تعلق ہے ہم خصوصیت سے دین کے انہی پنجگانہ اصولوں کو نظر و فکر کے سامنے رکھیں گے اور بتائیں گے کہ ان میں فرد و معاشرہ کی مشکلات کا حل کیونکر پنہاں ہے۔ نیز قرآن حکیم کے ان ارشادات۔ استفادہ کریں گے جو اس سلسلہ میں فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ ارشادات اتنے واضح اور زندگی کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو اس درجہ نکھارنے والے ہیں کہ ان سے استدلال کرنے میں ہمیں تکلف، تصنع اور بے جا تاویل سے کام نہیں لینا پڑے گا۔ یوں کہنا چاہیے کہ ان ارشادات کی حیثیت "دریا بہ حباب اندر" کی سی ہے ان میں تعبیر و تشریح کی وسعتوں کے باوجود الجھاؤ اور ابہام نام کو نہیں بلکہ بسا اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان آیات کا نزول ہمارے حالات کے مطابق ابھی ابھی ہوا ہے۔

کیا اساسی نہیں ہے؟

اس سے پیشتر کہ اساسیات اسلام کی تشریح کریں، پہلے ہی قدم پر اس امر کی وضاحت کر دینا نہایت ضروری سمجھتے ہیں کہ کیا اسلام نہیں ہے یا فکر و نظر کے کون انداز ہیں جن کا نفس دین سے دینی زندگی سے، اور دینی روح سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ وضاحت اس بنا پر ضروری ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی سے اٹھارویں صدی عیسوی تک دین و عقل میں جو شدید عیت کی نوک جھونک رہی۔ اس میں طربیہ یا المیہ یہ ہے کہ کلیسا نے جن چیزوں کو ن سمجھا، اور جن عقاید و نظریات کی حمایت میں علوم و فنون سے خواہ مخواہ لڑائی مول لی اور سائنسی ثافات کو جھٹلانے کی ضرورت محسوس کی، سرے سے دین میں ان کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ یسا نے تین سو سال کے اس تصادم میں اصولاً دو بھیانک غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ ایک تو ظن و م کے ہر اعجوبہ کو دین سمجھ لیا اور دوسرے فرق و امتیاز کے ان خطوط کو ملحوظ نہ رکھا جو دین حقائق علمیہ کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس کا ہولناک نتیجہ یہ نکلا کہ اخو فکر و دانش کے اٹل نتائج کے مقابلہ میں عیسائیت نے سپر ڈال دی۔ وجہ عیاں ہے۔ ں مقابلہ وہم و گمان اور علمی حقایق کے درمیان آ پڑے وہاں وہم و گمان کو ہار ماننے ہی بن ے گا۔ کلیسا نے کیونکہ اوہام و ظنون کی طرفہ طرازیوں سے عقیدت و وابستگی کے رشتے م کیے۔ اس کو فاضل ڈریپر کے دلچسپ پیرایۂ بیان میں دیکھنا چاہیے۔ اس کا کہنا ہے کہ ب ۱۵۶۰ء میں افقِ مغرب پر دُم دار ستارے کا طلوع ہوا تو اس سے یورپ کے دینی حلقو تہلکہ مچ گیا۔ کہا گیا کہ اس کی نحوست سے پورے ملک میں بیماریاں پھیلیں گی۔ جنگ کے ں گھن گرج کا مظاہرہ کریں گے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ محمد ثانی کو قسطنطنیہ میں عروج نصیب ا۔ ان خطرات کے پیش نظر کیتھلک ثالث نے ایک فرمان کے ذریعے دعاؤں کا حکم دیا۔ تاکہ یہ ہ اپنے منحوس مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تمام گرجوں میں اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ چنانچہ کئی ک گھڑیال بجتے رہے اور پادریوں کی مخلصانہ دعاؤں کی صدائے بازگشت سے کلیسا کے

درو بام لرزتے رہے۔ لیکن یہ سب بے کار تھا۔ دُم دار ستارہ اپنے راستے پر، شاہانہ وقار کے ساتھ برابر گام فرسا رہا۔ اور کوئی دعا یا کلیسا کی صدائے جرس و ناقوس اس کی راہ میں حائل نہ ہوسکی"[1]

ظاہر ہے دم دار ستارے کا تعلق علم النجوم سے ہے۔ دین سے نہیں۔ اور علم النجوم کی رُو سے ہر ایک ستارہ چاہے وہ شمس و قمر ہو، چاہے زہرہ و مشتری، چاہے کہکشاں ہو یا دُمدار اپنی متعین منزل، مخصوص مدار اور نپی تُلی چال رکھتا ہے۔ جس سے سرِ مو انحراف ممکن نہیں۔ ان سیاروں کا اپنا نظام ہے اور ان کی حرکت و گردش کے طبعی پیمانے ہیں اور فطری اصول و قواعد ہیں جن کے سختی سے پابند ہیں اور ان کی طبعی قوانین کی ریاضیاتی اور باقاعدہ اطاعت ہی وہ شئے ہے جس نے ان میں حسن و جمال کی اُن کیفیتوں کو پیدا کیا کہ جن کو دیکھ کر افلاطون پکار اٹھا تھا کہ میرے ذہن نے اللہ تعالیٰ تک دو دلائل کے ذریعے رسائی حاصل کی۔ ایک روح کی طرفہ طرازیوں کو دیکھ کر دوسرے اس نظام کا مشاہدہ کر کے جو افلاک اور ستاروں میں کارفرما ہے[2]۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے اپنے انداز میں توجہ دلائی ہے والشمس والقمر بحسبان[3] "سورج اور چاند کی رفتار مقررہ حساب کے مطابق ہے۔" وکل فی فلک یسبحون[4] "سب اپنے اپنے دائرہ میں رواں دواں ہیں۔"

نہ یہ ستارے کسی کے دشمن ہیں نہ دوست ہیں۔ نہ اُن کے طلوع سے کسی کا طالع نصیب چمکتا ہے اور نہ ان کے غروب سے کسی کی قسمت گہناتی ہے۔ یہ صرف روشنی اور نور کے کرے ہیں۔ جو فضائے نیلگوں پر گھومتے اور درخشانیاں بکھیرتے پھرتے ہیں۔ نحوست، بدنصیبی یا شگون و سعادت سے ان کا کوئی رابطہ نہیں۔ لیکن عیسائیت نے چونکہ روایت پرستی کے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اوہام دوستی کی اس فضا میں شعور و ادراک کی آنکھیں کھولی تھیں کہ جو صرف قدیم اقوام کے سا[تھ] مخصوص تھی۔ اس بنا پر وہم کی اس نوعیت کو عقاید کا جزو قرار دینے پر مجبور ہوئی۔ لیکن جب نیو[ٹن] اور کوپرنیک کے مطالعہ و تحقیق نے علم النجوم کے بارہ میں انکشافات کو پیش کیا تو عیسائیت کے بھر[م] اعتماد کو سخت نقصان پہنچا۔

اس مرحلہ میں ہم انجیل کی زبان میں یہ کہیں گے کہ وہ امور و مسائل، جن کا تعلق انسان کی ا[...]

---

[1] انٹالیکچول ڈویلپمنٹ آف یورپ جلد دوم مطبوعہ ۱۹۰۵ء، ص ۲۵۴۔

[2] لارنک ۱۱ ص ۹۶۶ [3] سورۂ رحمٰن آیت ۵ [4] یٰسٓ ۴۰

وتعمیر سے ہے، روح کی بالیدگی اور ارتقا سے ہے، روزمرہ کے فرائض وواجبات سے ہے، اخلاق سے ہے اور معاشرہ کی فلاح وبہبود سے ہے۔ ان کا تعلق بلاشبہ دین سے ہے۔ اس لیے ان کو قرآن ہی میں دیکھو اور سنت وحدیث کے دفاتر ہی میں تلاش کرو۔ لیکن وہ مسائل جن کا تعلق یکسر علوم و معارف سے ہے اور انسانی تجربات واکتشافات سے ہے ان کے بارہ میں جب بھی کوئی رائے قائم کرو تو انہی کی روشنی میں قائم کرو۔ کیونکہ ان کا اصل دین سے اور روح دین سے کوئی سروکار نہیں۔

فرض کیجیے کہ بطلیموسی نظام کی صحت واستواری مشکوک ہوجاتی ہے اور مختلف علوم اور تجربات سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ کائنات کے بارہ میں یہ قدیم تصور کہ یہ ارضی المرکز (GEOCENTRIC) ہے قطعی غلط ہے۔ اس لیے اس کے برعکس موجودہ دنیا یہ عقیدہ رکھنے پر مجبور ہے کہ مرکز آفتاب ہے۔ زمین نہیں، دریافت طلب یہ بات ہے کہ آخر اکتشافات کی اس نوعیت سے دین کا کون حصہ متاثر ہوتا ہے کیا۔ اس عالم کو شمسی المرکز (HELIOCENTRIC) مان لینے سے ارکان دین میں سے کسی رکن کا ابطال لازم آتا ہے؟ کیا اس سے وجود باری کے عقیدہ کو کوئی نقصان پہنچتا ہے، کیا آفتاب کو مرکز حرکت تسلیم کرلینے سے رسالت کے تصور پر کوئی زد پڑتی ہے ایمان بالآخرۃ کا نظریہ معرض خطر میں پڑجاتا ہے، یا اخلاقی وروحانی ارتقا کی ضرورت ختم ہوجاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی خطرہ بھی پیش نہیں آتا۔ پھر محض اس فلکیاتی نظریہ کو دین کا جزو قرار دے کر عقل، تجربہ اور سائنس کے خلاف ایسا محاذ کیوں قائم کیا جائے کہ جس میں آخرالامر شکست مذہبی حلقے کے حصہ ہی میں آئے۔ اور کیوں نہ یہ کہہ کر صحیح اور منصفانہ موقف اختیار کیا جائے کہ دین کو عقل وتجربہ کے نتائج سے نفیاً یا اثباتاً کوئی تعلق نہیں۔ اس کا اپنا دائرۂ کار اور اپنی مملکت ہے جس میں صرف اسی کا سکہ رواں ہے۔